تقریبِ یومِ پاکستان

قصرِ پاکستان کی بُنیاد کی اینٹیں

لاہور کے اقبال پارک میں (جو اس سے پہلے منٹو پارک کہلاتا تھا) وہ "مینارِ پاکستان" ایستادہ ہے جو مسلمانانِ ہند کے اس عزمِ بلند کی زندہ شہادت ہے جس کے نتیجے میں انہوں نے پاکستان کی عظیم مملکت حاصل کی تھی۔ لوگ دور دراز سے آتے ہیں اور اس مینار کی سربلندی و سرفرازی سے اس ملت کی سرو قامتی کی یاد تازہ کرتے ہیں جس نے اس قدر کوہ شکن اور خارہ شگاف عزم کا نعرہ بلند کیا تھا۔ وہ اس یادگار کی رفعتِ شان، اس کی محرابوں کے حسنِ تناسب، اس کے ڈیزائن کی انفرادیت، اس پر کندہ آیات اور پیغامِ اقبال کی نادرہ کاری کو دیکھتے اور اس مجسمۂ جلال و جمال کے حسن و رعنائی کی داد دیتے ہیں۔ یہ حضرات وہ سب کچھ دیکھتے ہیں جو سطحِ زمین کے اوپر ایستادہ ہے لیکن وہ اینٹیں جو اس کی بنیادوں میں گڑی ہیں، وہ کسی کو نظر نہیں آتیں۔ یہ وہ اینٹیں ہیں جو اس قدر سربفلک عمارت کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے کھڑی ہیں لیکن جن کی طرف اس عمارت کے زائرین کا خیال تک بھی نہیں جاتا۔ بنیاد کی اینٹوں کا مقدر یہی ہوتا ہے کہ وہ اس قدر کمرشکن بوجھ کو اپنے سر پر اٹھائے رکھیں لیکن ان کے دل میں بھی خواہشِ نمود تک بیدار نہ ہو۔ وہ ہر ایک کی نگاہوں سے پوشیدہ رہیں۔ اس حد تک پوشیدہ کہ ان کی ہستی اور موجودگی تک کا کسی کو احساس نہ ہو۔ کتنا بڑا ایثار ہے ان نادیدہ بوجھ اٹھانے والوں کا —— وہ ایثار جس کے بغیر اس عمارت کا ایک روڑہ تک بھی اٹھایا نہ جاسکتا۔

جو حالت مینارِ پاکستان کی ہے وہی کیفیت خود مملکتِ پاکستان کے قصرِ بلند و بالا کی ہے۔ اس کی بالائے سطحِ زمین کی عمارت ساری دنیا کی نگاہوں میں ہے لیکن اس کی بنیاد کی جن اینٹوں کے تصدق یہ وجود میں آئی تھی ان کی یاد تک ذہنوں سے مٹتی جا رہی ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام نے تو ان اینٹوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اس لئے یہ انہیں کس طرح فراموش کرسکتا ہے؟ یوں تو یہ اینٹیں ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں لیکن ۲۳ مارچ کو ان کی یاد کچھ زیادہ ہی شدت کے ساتھ اس کے قلبِ محزوں میں وجہِ "تلاطم" بنتی ہے۔ آج ہم ان اینٹوں میں سے ایک ایسی اینٹ کا تذکرہ باعثِ تزئینِ اوراق کرتے ہیں جسے اس بنیاد کا کونے کا پتھر کہا جائے تو ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا۔ اس سنگِ بنیاد کا تعارف، "حق شناس" کے قلم سے، طلوعِ اسلام کی مارچ ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا اور ۱۹۵۷ء میں یہ پرویز صاحب کے اضافہ کے ساتھ دوبارہ سامنے لایا گیا تھا۔ ہم ۱۹۸۲ء کے یومِ پاکستان کی تقریب اسی کے تذکرہ کے ساتھ منسلک کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں۔

غالباً ۱۹۴۳ء ـ ۱۹۴۴ء کا ذکر ہے، میں سرحد کے مضافات میں اپنے بچپن کے خوابوں کی تعبیر تلاش کر رہا تھا۔ وہ مضافات جو عمر بھر

میرے تصورات کی آماجگاہ اور مستقبل سے متعلق میری امیدوں کا محور بنے رہے تھے۔ میں جوں جوں وہاں بسنے والے آہنی انسانوں کی فطرت و نفسیات کا مطالعہ کرتا، مجھ پر عجیب و غریب راز منکشف ہوتے چلے جاتے۔ سب سے زیادہ تحیر انگیز ان کے سیاسی شعور کی بیداری تھی۔ ان دور دراز مقامات میں جہاں شاید ہی کبھی کوئی اخبار پہنچتا ہو، ہل چلانے والے کسان اور گدھے ہانکنے والے دہقان مقامی، ملکی، بین الاقوامی اور اسلامی سیاست سے متعلق اس قسم کے سوالات پوچھتے کہ ہمارے شہروں کے اچھے اچھے دانشوروں کے ذہن میں بھی نہ آسکیں۔ پھر، وہ بات کو سمجھتے اس تیزی کے ساتھ کہ فقرۂ آغاز سے فوراً مآل کار تک پہنچ جاتے۔ لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ حیرت افزا "ایک" اور "آواز" تھی جو ہر مقام اور ہر گوشے سے میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے جس سے بات کی اس نے کہا کہ صاحب! صدر صاحب نے بھی یہی کہا تھا "صدر صاحب کا بھی یہی فیصلہ ہے"۔ "ہم صدر صاحب سے پوچھ کر بتائیں گے"۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ یہ "صدر صاحب" کون بزرگ ہیں جن کے ذکر سے ساری فضا معمور ہے۔ میں یونہی پھرتا پھراتا ایک دن اپنے میزبان کے ہمراہ ایک جرگہ میں جا پہنچا جہاں ایک اہم مسئلہ زیر بحث تھا۔ مخالف و موافق سمت سے شعلہ فگن تقریریں ہو رہی تھیں، ہر پٹھان کے پاس اس کی رائفل یا طپنچہ اور کارتوسوں کی پیٹی کمر سے بندھی ہوئی۔ محفل میں اس قدر شدید حرارت پیدا ہو گئی کہ مجھے اندیشہ پیدا ہو گیا کہ اب یہ پٹھان "متشابہات" سے "محکمات" پر اتر آئیں گے اور فریقین میں گولی چل جائیگی۔ میں نے ایک پاس بیٹھے ہوئے بڈھے پٹھان سے پوچھا کہ اب کیا ہوگا؟ اس نے نہایت متانت سے جواب دیا کہ "وہی ہوگا جو صدر صاحب کہیں گے"۔ اب میری تمام حیرت سمٹ کر نگاہوں میں آگئی کہ بالآخر آج ان "صدر صاحب" کو دیکھ سکوں گا جن کے تذکروں سے ساری فضا معمور تھی۔ آخری مقرر کی تقریر کا دھواں ابھی فضا میں گم بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ایک گوشے میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی۔ ساری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہمہ تن آتش پٹھان، برفانی مجسمے بن گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک چھ فٹ سے بھی زیادہ قد آور، تنومند، قوی ہیکل، پیکر جھٹکا دے کر اٹھا اور نہایت متانت سے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ مجمع میں سے ہر شخص کی نگاہیں اس کی طرف مرکوز تھیں۔ سر پر دہقانی ٹوپی کے اوپر ایک چھوٹا سا پٹکا یونہی بے ترتیبی سے لپٹا ہوا۔ چوڑا چکلا چہرہ، سرسید جیسی ڈاڑھی۔ عقاب کی سی چمکدار، روشن آنکھیں۔ لبوں پہ معصومانہ مسکراہٹ۔ پنڈلیوں تک ایک لانبا کرتا اور اسی کپڑے کا دو گز کا "راشول"[1] والا شلوار[2]۔ ایک "چادر" یونہی ادھر ادھر شانوں سے لٹکتا ہوا۔ کرتے پر ایک صدری، جس کا ایک جیب توشہ دان اور دوسرا لیٹر بکس دکھائی دیتا تھا۔ یہ تھے "صدر صاحب" جن سے میں اتنے دنوں سے ہر گاؤں اور ہر قریہ میں غائبانہ طور پر متعارف ہوتا چلا آرہا تھا۔ انہوں نے مجمع پر ایک خاموش لیکن نہایت پر معنی نگاہ ڈالی۔ اور اس کے بعد نکھری اور سلجھی ہوئی پشتو میں تقریر شروع کی۔ میں محو حیرت تھا کہ سرحد کے کسی ویرانے میں بیٹھا ہوں یا لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس میں۔ ایک دہقانی پٹھان کو سن رہا ہوں یا چرچل اور ہٹلر کو (اس زمانہ میں ہٹلر کی تقریروں کی بڑی دھوم ہوا کرتی تھی) تقریر میں بین الاقوامی سیاست کا تجزیہ، ہندوؤں کی نگاہ فریب و سیہ کاریوں کی نقاب کشائی، تحریک قومیت پرستی کی ابلہ فریبیوں کا کچا چٹھا، مسلم لیگ کے خلاف اعتراضات کے جوابات، سیاست حاضرہ میں اسلامی نقطۂ نگاہ کی ترجمانی، سب کچھ آگیا اور اس مؤثر انداز سے کہ سامعین میں سے کوئی اونچی سانس تک نہیں لیتا تھا۔ تقریر میں کہیں بجلی سی کڑک اور بادلوں کی سی گرج تھی اور کہیں ندی کی

---

[1] سرحد کے اس پار، پٹھانوں کو "راشے" کہتے ہیں۔

[2] میں نے قصداً شلوار کو مذکر لکھا ہے اس لئے کہ پٹھان کی شلوار اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اسے مؤنث لکھنا اس کی تنکیر ہے۔

بے صوت نغمہ خوانیاں اور پُرسکوت روانیاں۔ اس تقریر کے بعد، اس مغنّیِ آتش نفس نے مجمع سے پوچھا کہو! آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ فیصلہ کیا تھا؟ وہی جو مجھ سے اس بڈھے پٹھان نے کہا تھا۔ کسی ایک اختلافی آواز کے بغیر، متفقہ طور پر سب نے اس پر صاد کیا جو "صدر صاحب" نے کہا تھا۔

رات کو میں نے کھانے کے بعد اپنے میزبان کو اٹھنے نہ دیا اور ان سے کہا کہ خدا کے لئے مجھے بتائیے کہ یہ "صدر صاحب" کون ہیں۔ انہوں نے خشک پشاوری تمباکو کا ایک لمبا سا کش لگایا اور حقہ کو اٹھوا کر میرے پاس بیٹھ گئے اور کہا۔

"غالباً ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ تحصیل صوابی (ضلع مردان) کے ایک گاؤں، نوا کلی، میں ایک کاشتکار نوجوان لڑکا ایک دن اپنے گھر کے صحن میں چارپائی پر لیٹ گیا اور اپنی والدہ، ہمشیرگان، بیوی، سب کو بلا بھیجا۔ وہ حیرت سے چارپائی کے گرد کھڑی ہو گئیں تو اس نوجوان نے ان سے کہا کہ "تم جی بھر کر رو لو کیونکہ تمہارے لئے آج سے مر چکا۔" یہ تحریکِ خلافت کا زمانہ تھا۔ یہ نوجوان باہر نکلا اور اگرچہ تحریک میں محض رضاکار کی حیثیت سے شامل ہوا لیکن اپنے حسنِ سیرت و کردار اور مخلصانہ قربانیوں اور سرگرمیوں سے علاقہ بھر میں آگ لگا دی۔ عوام میں سیاسی شعور کو بیدار کیا۔ حاجی صاحب ترنگزئی کے بند پڑے ہوئے مدرسے پھر سے کھلوائے۔ گاؤں گاؤں میں پنچائتیں قائم کیں۔ غرضیکہ اپنے راہنماؤں کی قیادت اور رفقاء کی معاونت سے علاقہ بھر میں تحریک کو ایک نئی زندگی اور زندگی کو ایک نئی تفسیر عطا کر دی۔ اس زمانہ میں سیاسی تحریکوں میں شرکت آگ سے کھیلنے کے مترادف تھی۔ چنانچہ اس تگ و تاز و سعی و عمل کی شدید مخالفتیں ہوئیں لیکن اس شعلہ جوالہ نے کسی کی بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی مساعی کو جاری رکھا۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۹ء تک قائم رہا، جب افغان جرگہ وجود میں آیا اور رضاکاروں کا نام "خدائی خدمتگار" رکھا گیا جو عوام میں سرخ پوشوں کے نام سے متعارف ہوئے۔ اس زمانہ میں خدائی خدمتگاروں کے مقاصد بڑے درخشندہ تھے۔ چنانچہ نوا کلی کے اس نوجوان نے اب سرخ پوشوں کی تنظیم کا بیڑہ اٹھایا اور چند دنوں میں اسے ایک مستقل جیش کی شکل دے دی۔ ۱۹۳۰ء میں کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو حکومت نے سرخ پوشوں کو خلافِ قانون جماعت قرار دے دیا۔ یہ نوجوان گرفتار ہوا اور چھ ماہ کی قید بامشقت کی سزا بھگتنے کے لئے جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ اسی دوران میں حکومت نے سرخ پوشوں پر سخت تشدد برتا جس سے یہ تحریک ماند سی پڑ گئی۔ چھ ماہ کے بعد یہ قید سے نکلا تو پھر وہی گرمجوشی پیدا ہو گئی۔ حکومت نے اس کا پھر تعاقب کیا تو یہ مفرور ہو گیا۔ لیکن فراری کی حالت میں بھی اپنا کام بدستور کرتا رہا۔ حتیٰ کہ پھر گرفتار ہو گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ کچھ دنوں بعد گاندھی اِروِن سمجھوتہ ہوا تو اسے بھی رہا کر دیا گیا۔ رہا ہونے پر پھر وہی گرمجوشیاں شروع ہو گئیں۔ ۱۹۳۱ء میں دوبارہ سول نافرمانی شروع ہوئی تو یہ صاحب روپوش ہو گئے اور حکومت اور پولیس کے علی الرغم روپوشی کی حالت میں برابر جماعت کی تنظیم کرتے رہے۔ حکومت نے تنگ آ کر ان کے والد اور بھائی کو گرفتار کر لیا۔ جب اس پر بھی آتشِ انتقام سرد نہ ہوئی تو ان کی جائے سکونت کو نیلام کر دیا اور سامانِ زمینداری کو جلا کر خاکستر بنا دیا۔ ان کا ایک قیمتی باغ کاٹ ڈالا اور مال مویشی سب ضبط کر لئے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی گرفتاری پر انعام مقرر کیا۔ ایک مخبر کی سازش سے ان کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اور دو سال قید بامشقت کی سزا پا کر پھر حوالۂ قید و بند ہو گئے۔ قید کے بعد رہا ہوئے تو عام انتخابات کا زمانہ تھا۔ انہوں نے انتخابات میں اس برق رفتاری سے کام کیا کہ کانگریسی اراکین کی اکثریت سے ڈاکٹر خان کی وزارت قائم ہو گئی۔ اس فتح و کامرانی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو سرحد تشریف لائے۔ اب یہ نوجوان، خان عبدالغفار خان کا دستِ راست اور صفِ اوّل کے راہنماؤں میں شمار کیا جاتا تھا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ کانگریس کے ایک ایسے

ذمہ دار لیڈر سے اس کی بے تکلف گفتگو ہوئی۔ اس کی نگۂ دوربین نے فوراً بھانپ لیا کہ ہندو کے عزائم کیا ہیں۔ اب ذرا سوچئے کہ حالات کیا تھے؟ صوبہ میں کانگریس کی وزارت تھی۔ پورے علاقہ میں سرخپوشوں کا راج تھا۔ خان عبدالغفار خان (ملنگ بابا) کی گویا پرستش ہوتی تھی۔ شہرت، عزت، مقبولیت، قوت، سب ایک طرف تھیں۔ لیکن جب اس مخلص نوجوان نے محسوس کیا کہ سرخپوشوں کو کسطرح ہندو عزائم کے لئے آلۂ کار بنایا جا رہا ہے تو اس نے ایک ثانیہ کے تامل کے بغیر عبدالغفار خان اور اس کے دوسرے ساتھیوں سے ملّتِ حنیفہ کے مؤسسِ اعلیٰ حضرت ابراہیمؑ کے اتباع میں، اعلانیہ کہہ دیا کہ: انا برآؤا منکم ومما تعبدون من دون اللہ (۶۰:۴) "ہم تم سے اور ان سب سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر محکومیت اختیار کئے ہوئے ہو قطع تعلق کا اعلان کرتے ہیں۔ کفرنا بکم وبدا بیننا وبینکم العداوۃ والبغضاء ابدا حتی تؤمنوا باللہ وحدہ "ہم تم سے بیزار ہیں۔ تم میں اور ہم میں کھلی ہوئی دشمنی اور عداوت رہے گی تاآنکہ تم ایک اللہ کی محکومیت پر نہ جھک جاؤ"۔ اس اعلان نے سارے علاقہ میں سنسنی پیدا کر دی۔ خان عبدالغفار خان باور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا بھی ممکن ہے۔ وہ خود چل کر نواکلی آیا اور دو دن تک ان سے مصروفِ افہام و تفہیم رہا۔ بحث و تمحیص اور ترغیب و ترہیب کے سب حیلے کر دیکھے لیکن ایک بے لوث انسان کا ایمان ایسا کمزور نہیں ہوا کرتا کہ ان حربوں سے لغزش میں آ جائے۔ گفتگوئے مصالحت ٹوٹی تو ان لوگوں کی طرف سے اذیت رسانیوں کے مختلف حربے بروئے کار آنے شروع ہو گئے۔ لیکن جس مردِ خود آگاہ کے عزائم کو انگریز کا تشدد کمزور نہ کر سکا تھا، اسے کانگریسی اقتدار کی معرفت رسانیاں کیا سرنگوں کرتیں؟ ادھر سے تشدد تھا اور ادھر کانگریسی روباہ بازیوں اور رابطہ فریبیوں کے خلاف ہر جگہ کھلی کھلی تبلیغ۔ لیکن اس وقت تک ان کی یہ تمام مساعی منفیانہ تھیں یعنی کانگریس کی مخالفت۔ یہ اپنی جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے اور دوسری کوئی جماعت ایسی تھی نہیں جس میں شامل ہو جاتے۔ اگرچہ اس زمانہ میں ملک میں مسلم لیگ کا چرچا ہو رہا تھا۔ لیکن مسلسل پراپیگنڈا کی رو سے مسلم لیگ کو حکام پرستوں کی جماعت سمجھا جاتا تھا۔ سرحد میں انگریزی حکومت نے اپنے ہم نواؤں سے ایک "اسلامی جرگہ" بنوایا تھا۔ جو عوام میں بے حد بدنام تھا۔ یہی جرگہ اپنے آپ کو مسلم لیگ کا حامی کہا کرتا تھا۔ اس لئے سرحد کا کوئی مخلص کارکن لیگ میں شمولیت کا نام تک نہ لیتا تھا۔

میرا میزبان یہاں تک پہنچا تھا کہ ملازم پھر حقہ لے کر آ گیا۔ انہوں نے خشک تمباکو کا ایک کش پھر لگایا اور کہنے لگے کہ یہاں تک بات پہنچی ہے تو بہتر ہے کہ تحریک مسلم لیگ کا پس منظر بھی سامنے آ جائے۔ (واضح رہے کہ میرا میزبان ایک خاموش سا مخلص مسلمان تھا جو نظریاتی حیثیت سے سیاسیات سے بڑی گہری دلچسپی رکھا کرتا تھا، اس لئے اس اعتبار سے اس کا تجزیۂ کوائف و حوادث بڑا صحیح ہوا کرتا تھا) انہوں نے کہا:

آپ کو معلوم ہے کہ انگریز کی حکومت نے، ہر روباہ صفت حکومت کی طرح، ایک ایسے طبقہ کی تخلیق کی تھی جو رعایا اور حکومت کے درمیان حاجب و دربان کا کام دے۔ یہ صوبہ سرحد کی بات نہیں بلکہ سارے ملک میں ایسا کیا گیا تھا۔ قومِ حاکم کے رعب اور اقبال کو قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ عوام کو حکام کے قریب نہ آنے دیا جائے۔ لہٰذا یہ طبقہ جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، پبلک اور افسروں کے درمیان واسطہ بنتا تھا۔ یہ طبقہ، دیہاتی زندگی میں بڑے بڑے زمینداروں، نمبرداروں، ذیلداروں اور سفید پوشوں پر مشتمل ہوتا تھا اور شہری زندگی میں نوابوں، خان بہادروں، کرسی نشینوں، آنریری مجسٹریٹوں، میونسپل اور ڈسٹرکٹ بورڈ کے ممبروں کو محیط۔ سرحد میں اس طبقہ کو بالعموم خوانین کا گروہ کہا جاتا تھا۔ چونکہ یہ "سرکارِ حضوری" تھے اس لئے عوام ان سے ڈرتے تھے۔ پبلک کی تمام مشکلات انہی کے توسط سے حل ہوتی تھیں۔ لہٰذا عوام کے دلوں میں ان کا "جبری احترام" رہتا تھا۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ جس راستہ سے کوئی خان بہادر گزر جاتا، دکاندار دست بستہ کھڑے ہو جاتے۔ کوئی معاملہ ان کی مرضی کے خلاف طے نہ ہونے پاتا۔ جس تقریب میں وہ شامل نہ ہوتے

وہ تکمیل تک نہ پہنچ سکتی - حتیٰ کہ لڑکی اور لڑکوں کے رشتے ناطے تک بھی ان کے استصواب کے بغیر قرار نہ پاتے - وہ عجیب زمانہ تھا۔ ان کی بڑی دھوم تھی۔

تحریک آزادی نے (جسے ہندوؤں کی زبان میں تحریک سوراج اور مسلمانوں کے الفاظ میں تحریک خلافت کہا جاتا تھا) عزت و احترام کے معیار بدل دیئے اور رفتہ رفتہ حالت یہ ہو گئی کہ وہی نواب اور کرسی نشین، وہی سردار اور خان، جن کی گزرگاہوں پر لوگ دو رویہ تعظیم کے لئے کھڑے رہا کرتے تھے، منہ چھپا کر گھروں میں بیٹھ گئے اور ان کے دروازوں پر "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے ماتم کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب ان کی کیفیت یہ تھی کہ اگر انہیں کسی اپنی غرض کے لئے بھی حکام کے پاس جانا ہوتا تھا تو رات کی تاریکیوں میں چوروں کی طرح چھپ چھپا کر نکلتے اور دبے پاؤں واپس آتے کہ کسی کی نظر نہ پڑے۔ کونسل، اسمبلی تو بڑی چیز تھی، اپنے شہر کی میونسپل کمیٹی کی ممبری کے لئے بھی کھڑے ہونے کی جرأت نہ رہی۔ اگر کوئی کسی حاکم کی مدد کے بھروسے پر کہیں درخواست دے بیٹھا تو اس طرح ذلیل و خوار ہوا کہ کچھ گرہ سے دے کر جان چھڑانا پڑی۔ ان کے مقابلہ میں لوگوں نے بھنگیوں اور چماروں کو امیدوار بنا کر کھڑا کیا اور دھڑلے سے کامیاب بنا دیا۔ چنانچہ یہ دور پندرہ بیس برس تک جاری رہا اور یہ طبقہ اسی طرح گمنامی کے گوشوں میں منہ چھپائے پڑا رہا، جس طرح سورج کی موجودگی میں چمگادڑیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ آزادی کی تحریک میں یہ لوگ شریک نہیں ہو سکتے تھے اس لئے کہ اس تحریک میں جائیدادوں کی ضبطی، تنگدستی اور اس کے بعد، حوالاتیں، جیل خانے، چکی کی مشقتیں، مار پیٹ، سامنے نظر آتی تھی۔ لہذا عزت کے تمام دروازے ان پر بند تھے اور ذلت کی تمام راہیں کشادہ، کہ اتنے میں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور قلبِ ملت جناب "قائداعظمؒ" نے ملت کا مقدمہ، جو سرتاسر حق و انصاف پر مبنی تھا اپنے ہاتھ میں لیا۔ ہنگامہ آرائیاں اور تلاطم خیزیاں ان کی فطرتِ سلیم کے خلاف تھیں۔ وہ تدبر اور دیانت سے مخالفین کو قائل کرنے کے عادی اور دلدادہ تھے۔ انہیں ضرورت صرف اتنی تھی کہ وہ جس عدالت میں اس عظیم مقدمہ کو لے کر جائیں قوم کی طرف سے مختار نامہ ان کے ہاتھ میں ہو۔ ہندوؤں نے ان کے اس مطالبہ کی مخالفت کی اور ان کی ہمنوائی میں (بدبختی سے) مسلمانوں کے اس طبقہ نے بھی جو تحریک آزادئ ہند کی گرمجوشیوں میں پیش پیش رہا تھا ایسا ہی کیا۔ لہذا اس میدانِ سیاست میں محترم قائداعظمؒ کے ساتھ کوئی نہ تھا۔ ان موقعہ پرستوں نے، جو کونوں کھدروں میں چھپے بیٹھے تھے، اس خالی میدان کو غنیمت سمجھا۔ انہیں محترم قائدِ ملت کی سلامت روی اور امن پسندی سے یقین تھا کہ اس میدان میں "خطرہ" کی کوئی بات نہیں۔ لہذا وہ اپنی چھنی ہوئی عزتوں اور کھوئی ہوئی عظمتوں کی بازیابی کے لئے باہر آ گئے اور "مسلم لیگ زندہ باد" کے نعروں سے قوم کے ترجمان بن گئے۔ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، محترم قائد کو اپنی بساطِ سیاست کی کامیابی کے لئے ضرورت ہی اس قدر تھی کہ جب بھی کہیں ان سے پوچھا جائے، تو یہ کہہ دیں کہ ہاں! قوم کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ ہے اور ہمارے مختار کار مسلم لیگ کے صدر، محترم قائداعظمؒ۔ یہ لوگ نہ پہلے، سرکار کے طرفدار کسی عقیدہ اور یقین کی بنا پر ہوئے تھے، نہ اب مسلم لیگ کے حامی کسی ملی نصب العین کے پیش نظر۔ وہ بھی موقعہ پرستی تھی اور یہ بھی موقعہ پرستی۔ قائداعظمؒ کی ذات اور اخلاص نے اس جماعت مسلم لیگ کا وقار جو درحقیقت ان کی ذات سے منسوب تھی، آسمان کی بلندیوں تک پہنچا دیا، اور یوں لکڑی کے ساتھ یہ لوہا بھی تیرنے لگا۔ جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے اس تحریک میں خطرہ کی تو کوئی بات تھی ہی نہیں۔ تھوڑا سا صرفہ ضرور تھا سو اس عزت کے مقابلہ میں جو انہیں اس طرح حاصل ہو رہی تھی، یہ سودا گراں نہیں تھا۔ اب وہی "ٹوڈی بچے" جن کا ماتم "ہائے ہائے" سے ہوا کرتا تھا "زندہ باد" کے نعروں میں حیاتِ جاوید کے مستحق قرار پا رہے تھے!

یہ تو تھی ملک کی عمومی حالت، صوبہ سرحد میں یہ تفاوت اور بھی نمایاں تھا۔ یہاں سرخپوشوں کی تحریک کو دبانے کے لئے انگریز نے ان سرکار پرست نوابوں، سرداروں، "مواجب خواروں" اور وظیفہ یابوں کو خاص طور پر استعمال کیا تھا۔ وہ جس قدر ظلم و تشدد چاہتا

تھا، انہی کے ہاتھوں سے کراتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صوبہ کے ایک ایک گھرانے میں ان سرکار پرستوں کے خلاف جذبات انتقام و غضب بھڑک رہے تھے۔ یہی وہ لوگ تھے جن سے "اسلامی جرگہ" عبارت تھا اور بدقسمتی سے یہی وہ تھے جو شروع شروع میں مسلم لیگ کے حامی بن گئے تھے۔ اب آپ خود ہی خیال فرما لیجئے کہ اس مسلم لیگ میں سرحد کا مسلمان کس طرح شریک ہو جاتا۔ کانگریسی مسلمان، لیگ کو انگریزوں کی خودساختہ جماعت کہا کرتے تھے اور اس کے لئے انہیں کسی دلیل کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لیگ کے حمایتی ان کے اس الزام کی زندہ دلیل تھے۔

یہ تھے وہ حالات جن میں نوانکلی کے اس "باغی سرخپوش" نے کانگریس کی مخالفت شروع کی تھی۔ اس کی فراست مومنانہ نے اسے اس نتیجہ پر پہنچا دیا کہ مسلمان کے لئے لیگ کی حمایت ہی صحیح مسلک ہے۔ اب یہ مرحلہ، پہلے مرحلہ سے بھی زیادہ حوصلہ طلب تھا۔ وہاں تو صرف کانگریسی رفقا اور سرخپوشی کی جماعت سے کٹ کر الگ ہو جانا تھا۔ یہاں اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ پیوست کرنا تھا جو اپنی سرکار پرستی میں گلی کوچے میں بدنام تھے۔ غور کیجئے۔ یہ مرحلہ کس قدر دشوار گزار اور ہمت طلب تھا لیکن اخلاص کے سامنے کوئی مرحلہ بھی مشکل نہیں ہوا کرتا۔ قائداعظمؒ نے اپیل کی کہ "مسلمانوں کے گھروں میں آگ لگ رہی ہے اور میں خطرہ کی گھنٹی بجا رہا ہوں۔ کوئی ہے جو اس کام میں میرا ساتھ دے" نوانکلی کے مرد مجاہد نے اس درد بھری اپیل کو سنا اور لبیک لبیک کہتا ہوا، ننگ و نام کی پروا کئے بغیر، مستانہ وار لیگ میں جا شامل ہوا۔ خود بھی اور اس کے جاں نثار رفیقوں کی جماعت بھی۔ کانگریسی زعما اور سرخپوشوں کے اباطیل نے ایک شور مچا دیا کہ "یہ بھی ٹوڈی ہو گئے"۔ لیکن سرحد کے مسلمانوں کے سامنے اس مرد قلندر کی ساری زندگی تھی۔ وہ علی وجہ البصیرت جانتے تھے کہ سب کچھ ہو سکتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ یہ شخص انگریز پرست ہو جائے۔ لہٰذا جس طرح ان حکام پرست لیگیوں کا وجود ہی لیگ کو سرکار پرست جماعت قرار دینے کی زندہ شہادت تھا، اسی طرح اس مرد بے باک اور اس کے رفقاء کی لیگ میں شمولیت، لیگ کو سرکار پرستی کے ملعون قبیل سے بچانے کی دلیل قاطع اور برہان نیرہ تھی۔ انسان کا کیرکٹر، دشمنوں سے بھی اس کا لوہا منوا لیتا ہے۔ پہلا بحران ختم ہونے کے بعد حالت یہ ہو گئی کہ جب کبھی کانگریسیوں کی طرف سے یہ طعن دیا جاتا کہ لیگ انگریز پرستوں کی جماعت ہے، اور جواب میں یہ کہہ دیا جاتا کہ کیا ارباب نوانکلی بھی انگریز پرست ہیں، تو ان کا منہ بند ہو جاتا۔

اب لیگ کچھ اور تھی۔ اب گاؤں گاؤں اور قصبہ قصبہ لیگیں بننی شروع ہو گئیں۔ ۱۹۴۰ء میں یہ مرد مجاہد، تحصیل صوابی کی مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ بس اس دن سے ان کا نام ہی "صدر صاحب" ہو گیا۔ صدر صاحب ایک غریب زمیندار تھے۔ اپنا اثاثہ پہلے لٹوا چکے تھے۔ لیگ کی تنظیم کے لئے روپیہ کہاں سے آتا؟ پہلے اپنا مکان رہن رکھا۔ پھر زمین رہن رکھی (یہ چیزیں حکومت کانگریس کے زمانہ میں واگزار ہو گئی تھیں۔) یہ سال بھر دورے میں رہتے۔ اس لئے کھیتی باڑی کی نگرانی کس طرح ممکن تھی؟ بہرحال سارا صوبہ ان کا مدح خواں اور ستائش گر تھا۔ ان کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لوگ ان نوابوں اور سرداروں پر اعتراضات کرتے تھے جو لیگ کے سربراہ بن رہے تھے۔ اس زہر کا اثر زائل کرنے کیلئے انہیں اشخاص اور اصول کے فرق کو ذہن نشین کرانا پڑتا تھا جو ایک مشکل کام تھا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنے اخلاص و کردار سے علاقہ بھر کو لیگ کا گرویدہ بنا دیا۔ اس جہاں گردی سے کھیتی باڑی کا سب دھندا برباد ہو گیا۔ اور گھر بار کے اخراجات بھی قرض سے چلنے لگے۔ اپنے علاقہ میں تو پھر بھی مکئی کی روٹیاں چادر میں باندھ کر پاپیادہ سفر ہو جاتا تھا۔ لیکن مشکل اس وقت آتی تھی جب لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لئے باہر جانا پڑتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ لیگ کے ہر اجلاس

میں شرکت کے لئے انہیں ایک ایک کھیت رہن رکھنا پڑتا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں صوبے کے انتخابات ہوئے اور صدر صاحب صوبہ مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔

جب مسلم لیگ کو اس طرح مقبولیت حاصل ہو گئی تو قوت و جاہ طلب افراد کے دلوں میں وزارت کا شوق انگڑائیاں لینے لگا۔ "صدر صاحب" نے انہیں اس ارادہ سے روکا۔ ان کا یہ فیصلہ نہایت تدبر و فراست اور دور اندیشی پر مبنی تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اس وقت لیگ کا جو بھرم بنا ہوا ہے وہ ان ارباب ہوس کی اقتدار پرستیوں سے خاک میں مل جائے گی۔ لیکن ان کی کسی نے نہ مانی اور..... .....نے لیگ وزارت مرتب کر لی"۔

اب ملازم قہوہ لے کر آ گیا اور میرے میزبان نے ایک فنجان مجھے دیا اور ایک خود اٹھایا۔ "صدر صاحب" کے متعلق داستان اس قدر دلچسپ تھی کہ میں چاہتا تھا کہ قہوہ کا فنجان جلدی سے ختم ہو جائے۔ لیکن پٹھان ایسا گرم قہوہ پیتے ہیں کہ اسے سانس کے زور سے کھینچ کر پینا (بلکہ یوں کہیئے کہ چکھنا) پڑتا ہے۔ پیالی ختم ہوئی تو میرے میزبان نے سلسلہ کلام کو پھر جاری کیا اور فرمایا۔

"اب سنو کہ کیا ہوا۔ وہی صدر صاحب جن کی مساعی کے صدقے ان خوانین کو یہ مسانید حکومت و اقتدار نصیب ہوئی تھیں ان کی نگاہوں میں کھٹکنے لگ گئے۔ اس لئے کہ وہ ہر نا روا حرکت پر روکتے تھے اور بہ حیثیت صدر مسلم لیگ ان کی کارروائیوں کا کڑا جائزہ لیتے تھے۔ لہٰذا سوچا یہ گیا کہ اس کانٹے ہی کو پہلو سے نکال دینا چاہیئے۔ چنانچہ آئین و قوانین کی تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے....... ور رفقاء ہم نے ... کے ایک صاحب کو صوبہ لیگ کا صدر بنا دیا اور صدر صاحب کو صدارت سے الگ کر دیا۔ اس فیصلہ سے سارے علاقہ میں آگ لگ گئی ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس آگ کا بجھانے والا کون ہے؟ خود "صدر صاحب"۔ یہ جگہ جگہ پھر رہے ہیں اور لوگوں کی منتیں کر رہے ہیں کہ خدا کے لئے لیگ کو نقصان نہ پہنچاؤ۔ آج کے جس جلسہ میں آپ گئے تھے۔ وہ بھی اسی غرض کے لئے منعقد ہوا تھا۔ لوگ تلے بیٹھے تھے کہ لیگ کو درہم برہم کر دیا جائے۔ وہ "صدر صاحب اور لیگ" کو دو الگ الگ چیزیں تصور ہی نہیں کر سکتے۔ ان کا یہی فیصلہ تھا لیکن اس فیصلہ کو الٹ دینے والے یہی صدر صاحب تھے۔ یہ تماشا تو آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے"۔

اس وقت نصف شب کے قریب گزر چکی تھی۔ میرا میزبان مجھے شب بخیر کہہ کر چلا گیا اور میرے لئے تصورات کی ایک دنیا پیچھے چھوڑ گیا۔ میں حیران تھا کہ یا اللہ! ہم میں ایسے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کی سیرت کی بلندی اور کردار کی پختگی کا یہ عالم ہے۔ میں اس سے پیشتر یہ باور کرنے کے لئے بھی تیار نہ تھا کہ ہمارے برسے ہوئے بادلوں میں ہنوز ایسی ایسی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ علی الصبح میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے نو نکل جا نکلا تا کہ اس مرد مومن کے ہاتھوں کو بوسہ دے سکوں لیکن وہ گزشتہ شب کسی اور طرف "دورہ" پر نکل گئے تھے۔ وہاں، بہر حال، میں ان کے رفقائے کار سے ملا اور ان سے بھی بہت کچھ سنا۔ صدق مقال اور اکل حلال کی جن داستانوں کو ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے اس کا آنکھوں دیکھا حال نو نکل کے ان لوگوں کی زبانی سنا۔

اب صوبہ کی حکومت نے، ہر مستبد حکومت کی طرح، صدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو طرح طرح سے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ الزام تراشی، تہمت طرازی، پولیس کی نگرانی وقس علیٰ ذالک۔ ہر وہ حربہ جو حق گوئی اور بے باکی کے جرم میں استعمال ہوتا چلا آیا ہے، استعمال کیا گیا۔ وہ اس قسم کی اذیت رسانیوں میں مصروف تھے اور صدر صاحب اس کوشش میں سرگرم مارے مارے پھر رہے تھے کہ عوام، لیگ کے خلاف نہ ہو جائیں۔ لیکن اب یہ ناسور، صدر صاحب کی کوششوں سے اچھا نہیں ہو سکتا تھا۔ اب اس ناؤ کو انسان کی دعائیں بچا نہیں سکتی تھیں۔ لیگ حکومت کی بدعنوانیاں اور بے ضابطگیاں اس درجہ بڑھ چکی تھیں کہ وہ پٹھان جنہیں انگریز

کے تصور سے نفرت تھی، وہ دعائیں مانگتے تھے کہ اس حکومت کے بدلے دفعہ ۹۳ کے ماتحت گورنری راج ہی آجائے۔ یہی تھے وہ اسباب جن کی بناء پر صدر صاحب صوبہ میں لیگ وزارت کے قیام کے خلاف تھے۔ لیکن اس معاملہ میں بھی خود صدر صاحب سب سے بڑھ کر مشکل میں تھے۔ کانگریسی مسلمان جگہ جگہ انہیں طعن دیا کرتے تھے کہ کیوں! یہی ہے وہ آزاد حکومت جس کے لئے تم ہم سے الگ ہوئے تھے۔ مسلم لیگی عوام جو محض صدر صاحب کی کوششوں سے لیگ میں شامل ہوئے تھے حکومت کی ہر بدعنوانی کے لئے صاحب صدر کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے کہ

اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

اور حکومت کا ان کے ساتھ جو سلوک تھا اسے ہم اوپر دیکھ چکے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود لیگ کے مقصد سے ان کا عشق تھا کہ انہیں لئے لئے پھر رہا تھا۔ رفتہ رفتہ لیگ وزارت سخت بدنام ہو گئی اور اس کے بعد وہ خود اپنے بوجھ ہی سے ٹوٹ گئی۔ صدر صاحب نے قیام وزارت سے پہلے ہی اس کے انجام کے متعلق جو کچھ کہہ رکھا تھا، وہی کچھ ہو کر رہا۔ اب پھر ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت برسرِ اقتدار تھی اور لیگ کے لئے حالات سخت ناساعد اور صدر صاحب کے لئے فضا بے حد ناسازگار۔ لیکن وہ اس پر بھی برابر مصروفِ سعی و عمل رہے کہ ناسازگار ماحول سے متاثر ہو کر مایوس ہو جانا ان کی فطرت ہی میں نہیں۔

۱۹۴۶ء میں بمبئی میں فسادات ہوئے تو سرحد سے ایک تحقیقاتی کمیٹی، صدر صاحب کی صدارت میں تفتیشِ حالات کے لئے بھیجی گئی۔ وہاں سے واپسی پر صدر صاحب کو دہلی میں معلوم ہوا کہ پنڈت جواہر لال نہرو بغرض سرحد جانے والے ہیں۔ صدر صاحب کی نگاہ اس موقعہ کی اہمیت کو بھانپ گئی۔ انہوں نے وہیں سے پراونشل مسلم لیگ سرحد کے سیکرٹری کو تار دیا کہ صوبہ لیگ کا ایک اجلاس خصوصی فوراً طلب کیا جائے۔ صدر صاحب خود پنڈت جواہر لال کے سرحد پہنچنے سے تین دن قبل پشاور پہنچ گئے اور لیگ کے اجلاس میں اس مسئلہ کی اہمیت کو اس طرح واضح کیا کہ اراکین کو اپنے ساتھ ہم نوا کر لیا۔ ان تین دن میں، صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار نے وہاں کیا کچھ کیا، اس کا جواب اس سے لیجئے کہ جواہر لال صاحب کے ساتھ سرحد میں کیا کچھ ہوا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس میں بہت سے دیگر دردمند اور صاحبِ ہمت حضرات کی کوششیں بھی شامل تھیں لیکن صدر صاحب اور ان کے رفقاء کا اس میں نمایاں حصہ تھا۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلہ پر حملہ کرنے کے الزام میں صدر صاحب پر مقدمہ بھی چلایا گیا۔

اسی دوران میں حلقہ مردان میں ایک ضمنی انتخاب سامنے آیا جس کے متعلق ڈاکٹر خان صاحب نے دہلی سے چیلنج دیا تھا کہ کانگریس اور لیگ کی فتح و شکست کا مدار اسی انتخاب پر ہے۔ یہ صدر صاحب کا اپنا علاقہ تھا۔ اس میں انہوں نے اس تن دہی اور جانفروشی سے کام کیا کہ اللہ کی نصرت نے ان کی مساعی کو کامرانی سے نوازا۔ اور انتخاب لیگ کے حق میں ہوا۔ اب صدر صاحب نے بھانپ لیا تھا کہ صوبہ میں کانگریس کا زور توڑنے کے لئے حکومت سے تصادم ضروری ہے۔ لہٰذا انہوں نے مردان سے سول نافرمانی کی ابتداء کر دی اور پھر پشاور پہنچ کر اسے وسیع پیمانے پر پھیلانے کا پروگرام مرتب کر لیا۔ اتنا کرنے پائے تھے کہ حکومت نے انہیں گرفتار کر کے جیل خانہ بھجوا دیا۔ اس موقعہ پر قدرت نے حضرت پیر صاحب مانکی شریف (اعلی اللہ مدارجہ) کو اس طرف متوجہ فرما دیا۔ اور انہوں نے اس ہمت، جرأت اور بے باکی سے اس تحریک کو کامیاب بنایا کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی (حضرت پیر صاحب کے مجاہدانہ تگ و تاز اور اس کا "صلہ" ایک الگ داستان ہے اور فرصت کی محتاج) صدر صاحب کو جیل گئے قریب چھ ماہ ہوئے تھے کہ سرحد میں ریفرنڈم کا چرچا ہوا۔ اب جو ان کی رہائی ہوئی ہے تو انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ حق اور باطل کا آخری معرکہ ہے۔ اس معرکہ میں حق کی کامیابی کے لئے صدر صاحب نے صوبہ بھر میں بگولے کا سا رقص کیا اور وہاں کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ ادھر پیر صاحب مانکی شریف کی مجاہدانہ مساعی

نے فضا کا رنگ بدل دیا) اللہ نے ان مخلص کارکنوں کی کوششوں کو اپنی توفیق و تائید سے نوازا اور سرحد میں ہندو کی سازشیں ختم ہو گئیں۔ والحمد للہ علیٰ ذالک۔

اس کے بعد پھر لیگ وزارت قائم ہو گئی اور پھر وہی خود غرضانہ و سیسہ کاریاں شروع ہو گئیں۔ حضرت پیر صاحب کے ساتھ وہاں کیا کیا گیا، یہی حدیث کچھ کم جگر خراش نہیں۔ لیکن اس سے کہیں الم انگیز ہے یہ داستان کہ صوبہ سے اس تشتت و انتشار کو ختم کرنے کے سلسلہ میں صدر صاحب نے جو جد و جہد کی اسے متعلقہ حلقوں میں غلط معنی پہنائے گئے۔ بے غرض انسان کے ساتھ یہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ یہ خلفشار بڑھ رہا تھا کہ اتنے میں جہادِ کشمیر شروع ہو گیا اور یہ اللہ کا بندہ سیدھا میدانِ جنگ میں جا پہنچا۔

پچھلے دنوں سرحد میں مسلم لیگ کے انتخاباتِ جدید ہوئے اور جس طریق سے یہ انتخاب عمل میں آئے اگر اس کی تفاصیل بیان کی جائیں تو ہر قلبِ حساس کی نگاہیں شرم سے زمین میں گڑ جائیں۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ انتخاب تو ایک طرف رکنیت کے فارم تک بھی ایک خاص حلقہ سے باہر نہیں جانے دیئے گئے۔ اس سلسلہ میں حضرت پیر صاحب مانکی شریف کو جس طرح کراچی کے چکر لگانے پڑے وہ ہم سب کے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ فارم صدر صاحب اور ان کے رفقائے کار یا حضرت پیر صاحب اور ان کی جماعت کو کبھی نہیں مل سکتے تھے۔ ان جیسے "باغیوں" کا بھلا لیگ میں کیا کام؟

اب صورت یہ ہے کہ ٹونگلی کا یہ مردِ مجاہد جس کی تمام عمر مسلمانوں کو سربلند دیکھنے اور اپنے صوبہ میں پاکستان کا علم بلند کرنے میں صرف ہو گئی اور جس نے اس مقصدِ عزیز کے حصول کی خاطر اپنا سب کچھ لٹا دیا، اب پاکستان کی "اسلامی حکومت" میں اپنے گاؤں کے ایک حجرے میں معتوب و مغضوب پڑا ہے۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس "کانٹے" کو پہلو سے نکالنے کے لئے اربابِ ہوس و اقتدار کس کس قسم کے نشتر استعمال کریں۔ جرم اس کا صرف یہی ہے کہ قالوا ربنا اللہ۔ یہ کہتا ہے کہ جھکنا صرف خدا کے حضور جائز ہے اور سب اس کے بندے اور مخلوقِ خدا کے خادم ہیں۔ وہ کہتا یہ ہے کہ جن مقاصد کا اعلان کر کے قوم کو دعویٰ پاکستان کا ہمنوا بنایا تھا ان وعدوں کو پورا کرو۔ خدا کے بندوں کو خدا کی محکومی میں رکھو۔ پاکستان کو غریبوں کی امیدوں کا ماویٰ و ملجا بننے دو۔ اسے اپنی کامرانیوں کا جہنم نہ بناؤ۔ آج ایسا کہنے والے کی سزا اس سے بھی سخت ہونی چاہیئے! اس میں شبہ نہیں کہ اگر صدر صاحب آج بھی چاہیں تو صوبہ میں لیگ کے مقابل ایک فعال جماعت قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ ملت میں تفرقہ کسی قیمت پر بھی جائز نہیں سمجھتے۔ اس لئے وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ وہ خود مٹ جائیں گے لیکن قوم میں تفرقہ پیدا نہیں ہونے دیں گے۔

بہرحال یہ ہیں مختصر سے کوائفِ زندگی معمارانِ پاکستان میں سے اس ایک کے جس کی ہڈیوں کے چونے اور لہو کی سرخی سے یہ قصرِ جمیل تیار ہوا ہے اور جو اب اربابِ ہوس کا عشرت کدہ بن رہا ہے۔

اگر آپ اس مردِ مجاہد سے ملنا چاہیں تو ضلع مردان کے گاؤں ٹونگلی میں جائیے۔ وہاں بخت جہاں خاں کہہ کر نہ پوچھئے کہ گاؤں کے نو عمر لڑکے اس نام سے آشنا نہ ہوں گے۔ "صدر صاحب" کہہ کر دریافت کیجئے تو پانچ سال کا بچہ بھی آپ کو سیدھا اس کھیت کی طرف لے جائے گا جہاں پاکستان کا یہ بطلِ جلیل کہ جس کا مقام آج اس قدر بلند ہونا چاہیئے تھا، گھاس کھود رہا ہو گا۔ (۱۹۴۹ء)

اضافہ

(پرویز)

اب اسے ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر

یہ ۱۹۴۹ء تک کی داستان ہے۔ مجھے اس میں اس مقام پر ایک کڑی کا اضافہ کرنا ہے جہاں یہ کہا گیا ہے کہ یہ مردِ مجاہد

کسطرح کانگریس (سرخپوشوں کی جماعت) سے کٹ کر مسلم لیگ کی طرف آیا۔

طلوع اسلام ۱۹۳۸ء میں جاری ہوا۔ مقصد اس کا مطالبۂ پاکستان کی تائید و حمایت تھا کہ یہ مطالبہ اس کے نزدیک دین کا تقاضا تھا۔ اگرچہ اس کے مد مقابل نیشنلسٹ مسلمانوں کی تمام جماعتیں تھیں، لیکن اس کا خصوصی محاذ، قومیت پرست "علماء" کا گروہ تھا جو مذہب کے نام پر عوام کو اس تحریک سے دور رکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بنابریں، طلوع اسلام میں جو کچھ شائع ہوتا وہ کتاب و سنت کی تعلیم پر مبنی ہوتا تھا۔ میں اگرچہ اس زمانے میں سرکاری ملازمت میں منسلک تھا۔ لیکن اس کا ہر ایک کو علم تھا کہ اس قرآنی فکر کا سرچشمہ کہاں ہے۔ میری قیامگاہ ان سرگرمیوں کا مرکز ہوا کرتی تھی۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک شام وہی بزرگ (جو بعد میں "صدر صاحب" کے لقب سے پکارے گئے) میرے ہاں تشریف لائے۔ بڑے غصے میں بھرے ہوئے۔ نظر آتا تھا کہ وہ جنگ کے لئے بالکل تیار ہیں۔ لیکن میں نے (حسب معمول) لینت اختیار کی۔ چند ہی ثانیوں کے بعد میں نے محسوس کر لیا کہ ان کا وہ غم و غصہ اور جوش و خروش خلوص پر مبنی ہے۔ وہ دیانتداری سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ کانگریس کی تحریک مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے لئے مفید ہے۔ میں نے انہیں کتاب و سنت کی روشنی میں مطالبۂ پاکستان کی کیفیت، ماہیت، علت، اور غائت سمجھانے کی کوشش کی۔ دوسری یا تیسری نشست میں انہوں نے اسی جوش اور ولولے کے ساتھ کہہ دیا کہ میں سمجھ گیا۔ مسلمانوں کے لئے ایک ایسی آزاد مملکت کا قیام جس میں قرآنی نظام رائج ہو، دین کا تقاضا ہے اور اس کے لئے ہر ممکن کوشش اسلامی جہاد۔ یہ کہہ کر وہ میرے ہاں سے اٹھے اور سیدھے سرحد چلے گئے اور وہاں جا کر سرخپوشوں سے علیحدگی کا وہ اعلان کر دیا جس کا ذکر آپ اوپر پڑھ چکے ہیں۔ میرے ساتھ ان کا یہ قلبی رشتہ اس زمانے میں استوار ہوا۔ دن بدن بڑھتا گیا اور آخری وقت تک قائم رہا۔ میرے ہاں ان کی کیفیت بالکل گھر کے بزرگ کی سی تھی۔ یہاں کے بچے ان کی گود کے پروردہ تھے۔ لہذا وہ جب بھی تشریف لاتے، مجھے نہ کسی قسم کا تردد کرنا پڑتا، نہ کوئی خاص اہتمام۔ (ویسے بھی ان کی زندگی ایسی سادہ تھی کہ ان کے لئے کسی قسم کے اہتمام کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی)۔ وہ بچوں میں بالکل بچے بن جاتے تھے۔ انہیں ان سے بڑا پیار اور انہیں ان سے بڑی محبت تھی۔

میری قرآنی فکر سے انہیں والہانہ دلبستگی تھی۔ وہ اس کے سفیر رواں تھے۔ انہوں نے اس شمع قرآنی کی روشنی سرحد کی تیرہ و تاریک چٹانوں تک پہنچا دی۔ صوبہ سرحد اپنی متشدد قدامت پرستی کے لئے مشہور ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس میں ان کی کس قدر مخالفت ہوتی ہوگی۔ لیکن انہوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ وہ طلوع اسلام کی ہر کنونشن میں نہایت جذب و شوق اور جوش و ولولے کے ساتھ شریک ہوتے۔ اور ان کی ایمانی حرارت اس تحریک کے پروگراموں میں بڑی حدت اور گرمجوشی پیدا کر دیتی۔ ان کا وجود فی الحقیقت روشنی کا مینار تھا۔ اور ان کے معصومانہ قہقہے بانگ درا۔

لیکن ادھر سے ہٹ کر آپ پھر وہیں پہنچئے جہاں "حق شناسی" نے ۱۹۴۹ء تک انہیں پہنچا یا تھا۔ سرحد کی مسلم لیگی حکومت کو ان کا اپنے گاؤں میں گھاس کھودنا بھی خوش نہ آیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی حق گوئی اور بے باکی، اور دوسری طرف عوام میں ان کی بے پناہ مقبولیت سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔ نتیجہ یہ کہ ان کو جلا وطن ہونا پڑا۔ وہ کراچی آ گئے اور وہاں نہایت خاموشی سے تمباکو فروشی کا کچھ دھندا شروع کیا۔ لیکن کہاں صدر بخت جمال خاں اور کہاں تمباکو فروشی! اس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد ان پر کیا گزرتی رہی، میں ان جگر سوز تفاصیل میں جانا نہیں چاہتا۔ بس اتنے پر ہی اکتفا کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی زندگی کے آخری سال گمنامی ہی میں نہیں بلکہ اس قدر صعوبات، تفکرات اور پریشانیوں میں گزرے کہ ان کے تصور سے دل کا خون آنکھوں میں کھنچ آتا ہے لیکن اس مرد غیور نے کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کیا۔ تحریک کے زمانے کے رفقاء میں سے اکثر اقتدار کی کرسیوں پر متمکن تھے۔

انہوں نے کسی کے دروازے پر دستک نہ دی۔ مجھے انتہائی رنج ہی نہیں بلکہ صدمہ اس بات کا ہے کہ ان حضرات کو ان کی پریشانیوں کا علم اور ان پر جس قدر زیادتیاں ہوئیں، ان کی خبر تھی۔ لیکن ان میں سے کسی نے ان کی مدد کرنا تو ایک طرف، اظہار ہمدردی تک بھی نہ کیا۔ وہ طلوع اسلام کنونشن (منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء) میں تشریف لائے تو ان کی صحت بہت گر چکی تھی۔ (بایں ہمہ، ان کے جوش و ولولہ اور سرگرمیٔ عمل میں کسی قسم کی کمی نہیں آئی تھی) میں نے محسوس کر لیا کہ اب یہ دیوار گرا ہی چاہتی ہے۔ چنانچہ ۲۴ فروری ۱۹۷۵ء کی شب مجھے نوانکلی سے ٹیلیفون پر اطلاع ملی کہ صدر صاحب نہایت خاموشی سے اس دنیا کو چھوڑ کر وہاں چلے گئے جہاں سے ان کی آواز کبھی بھی سنائی نہیں دینے کی۔ میری زبان سے بے ساختہ نکلا۔ کہ ؎

دہر میں اک چراغ تھا، نہ رہا......

مجھے کوئی ایسا ذریعۂ سفر میسر نہ آسکا کہ ان کے جنازہ میں شرکت کر سکتا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ان کے جنازہ میں کون کون شریک ہوا قیاس یہی ہے کہ یہ گاؤں کے لوگوں تک ہی محدود رہا ہوگا۔ اتنا ہی نہیں، میں نے کسی اخبار میں ان کی وفات کی خبر تک نہیں دیکھی۔ سرحد کے کسی مقامی اخبار میں کوئی خبر شائع ہوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ آہ! کس قدر احسان فراموش ہے ہماری قوم! میں یہ تو نہیں کہونگا کہ اگر یہ شیر غاب، مسلک قومیت پرستی کو چھوڑ کر تحریک پاکستان کا مؤید نہ بنتا تو پاکستان وجود میں نہ آتا۔ لیکن اتنا تو بلا شائبہ تردید اور اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اس صورت میں کم از کم صوبہ سرحد پاکستان کا حصہ نہ بن سکتا۔ اور اس کے جو نتائج ہوتے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تھا مقام اس محسنِ ملت کا، جسے اس کی قوم نے جیتے جی اپنے ہاتھوں دفن کر دیا۔ اور جس کی موت پر اس کی آنکھ سے ایک قطرۂ اشک تک نہ ٹپکا!

اے پیکرِ صدق و صفا! اے مجسمۂ خلوص و محبت! اے محسنِ ملت! اے معمارِ پاکستان! اے فدائی اسلام! اے پروانۂ شمع قرآن! خدا آپ کو اپنے سحاب کرم کے سایۂ عاطفت میں رکھے۔ طوبیٰ لکم وحسن مآب۔

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

[یہ تھا مختصر سا تعارف، قصرِ پاکستان کی بنیاد کی ایک نہایت مستحکم اینٹ کا۔ کسی کو کیا معلوم کہ اس قسم کی کتنی اینٹیں اس طرح تہِ خاک مدفون ہیں کہ کسی کو ان کا نام تک یاد نہیں۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را۔]

دل فگار

پرویز (۱۹۷۵ء)

احتیاط برتیئے!

لفافہ بند کرتے وقت احتیاط سے دیکھئے کہ آپ کا خط لفافہ کی گوند کے ساتھ تو نہیں چپک گیا۔ آج کل اکثر خطوط اس طرح موصول ہوتے ہیں کہ انہیں لفافہ سے چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کئی خطوط پھٹ بھی جاتے ہیں۔ آپ کی تھوڑی سی احتیاط سے آپ کا خط محفوظ طریق سے ہم تک پہنچ جائے گا۔ شکریہ

(ناظم ادارہ طلوع اسلام)